Negative Religious Sensibility in 21-Century Urdu Short Story

اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں منفی مذہبی طرزِ احساس

Javeria Imtiaz *1
PhD Scholar, Department of Urdu ,University of Education, Lahore.
Dr.Saima Ali*2
Associate Professor, Department of Urdu, University of Education , Lahore.

جویریہ امتیاز☆1
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
ڈاکٹر صائمہ علی☆2
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

Correspondance:saima.ali@ue.edu.pk

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 29-04-2026
Accepted:28-06-2026
Online:28-06-2026

Copyright:© 2026 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: The 21st-century Urdu short story reflects a profound ideological shift, notably characterized by the emergence of a "negative religious sensibility." Modern Urdu fiction writers have critically engaged with these phenomena rather than merely romanticizing faith. Far from outright rejection, this "negative sensibility" functions as a critical introspective tool. By dissecting sectarianism, religious hypocrisy, and the erosion of secular ethos, 21st-century Urdu afsana provides a poignant commentary on contemporary existential crises. Ultimately, this genre serves as a mirror to society, questioning rigid orthodoxies while striving to reclaim a more humane, inclusive, and compassionate spiritual essence within modern literature.

KEYWORDS: short stories, Literature, 21st century, modernism, existential crises, Genre, Spirtual Essance.

منفی مذہبی طرزِ احساس سے مراد وہ فکری، نفسیاتی اور سماجی رویہ ہے جس میں مذہبی عقائد اور شعائر کو ان کی اصل اخلاقی اور روحانی تعلیمات کے بجائے تعصب، عدم برداشت، فرقہ واریت، انتہاپسندی، تشدد، نفرت، جبر یا ذاتی و سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا جائے۔(1)

منفی مذہبی طرزِ احساس کے نتیجے میں مذہب کی حقیقی روح، یعنی محبت، رواداری، عدل اور احترامِ انسانیت پس منظر میں چلی جاتی ہے جبکہ تعصب، عدم برداشت اور نفرت جیسے رویے فروغ پانے لگتے ہیں۔ ایسی فضا میں اختلافِ رائے کو برداشت کرنے کے بجائے اسے دشمنی سمجھا جاتا ہے جس سے معاشرتی ہم آہنگی متاثر ہوتی ہے اور مختلف مذہبی و مسلکی طبقات کے درمیان فاصلے بڑھنے لگتے ہیں۔ یہی ذہنیت بعض اوقات اقلیتوں کے ساتھ امتیازی سلوک، عبادت گاہوں پر حملوں، گروہی تشدد، جبری نقل مکانی، تعلیمی اداروں پر حملوں اور مذہب کے نام پر تشدد کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انسانی جان، مال اور عزت کے ساتھ ساتھ قانون کی بالادستی، سماجی انصاف اور قومی یکجہتی بھی متاثر ہوتے ہیں، جبکہ مذہب کا اخلاقی اور روحانی تشخص بھی مجروح ہو جاتا ہے۔

منفی مذہبی طرزِ احساس معاشرے میں مختلف سماجی، فکری اور عملی رویوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب مذہبی تعلیمات کی اصل روح سے ہٹ کر تعصب، عدم برداشت اور غلبے کی سوچ کو فروغ دیا جاتا ہے تو اس کے اثرات معاشرتی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ کہیں اقلیتوں کو مذہبی شناخت کی بنیاد پر امتیازی سلوک اور تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کہیں عبادت گاہیں انتہاپسندانہ حملوں کا نشانہ بنتی ہیں، کہیں تعلیمی اداروں اور اہلِ علم کو خاموش کرانے کی کوشش کی جاتی ہے، کہیں فرقہ وارانہ منافرت اور گروہی تشدد جنم لیتا ہے اور کہیں مذہب کو سیاسی، معاشی یا ذاتی مفادات کے حصول کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے۔ یہ تمام رویے نہ صرف معاشرتی انتشار اور اخلاقی زوال کو جنم دیتے ہیں بلکہ مذہب کی حقیقی روح کو بھی مسخ کر دیتے ہیں۔(2)

اگر ہم ایک لمحہ کے لیے شاعری اور افسانہ نگاری کے اظہار کا تقابل کریں تو ہم پر باآسانی واضح ہو جاتا ہے کہ شاعری اپنے آہنگ و اوزان کی تو پابند ضرور ہے تاہم اظہار کے اعتبار سے شاعری کہیں پابند نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس افسانہ اظہار کا پابند نظر آتا ہے اس قید کے باوجود نیا افسانہ نگار ان پابندیوں سے فرار کی راہیں تلاش کرتا ہوا ملتا ہے۔ اس ضمن میں مہدی جعفر کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ”افسانہ نگار اپنے اظہار پر ترسیل کی پابندی سے بالکل چھٹکارا حاصل کرنے
> میں شاید حق بجانب نہیں ہے۔ شعوری طور پر نہ سہی تو لاشعوری طور پر

ترسیل اپنا اثر ڈالتی ہے۔ ترسیل کے سلسلے میں جو زنجیر اسے پابند کرتی ہے عموماً بیانیہ کی ہے۔ نئی نسل کا افسانہ نگار اپنی ذہنی فعالیت کی بنا پر زیادہ پابند نہیں رہنا چاہتا، اس میں استقلال و استقرار کی کمی ہوتی ہے۔ طرّہ یہ کہ اس دور میں صبر و قرار جیسی اشیاء عنقا ہوتی جا رہی ہیں۔ (3)"

اکیسویں صدی کا اردو افسانہ انھی مظاہر کے پس منظر میں کارفرما نفسیاتی، سماجی اور فکری عوامل کا باریک بینی سے جائزہ لیتا ہے۔ معاصر افسانہ نگار مذہب کی غلط تعبیرات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انسانی المیوں، سماجی انتشار اور اخلاقی بحرانوں کو نمایاں کرتے ہوئے بالواسطہ طور پر مذہب کی اصل روح، یعنی امن، رواداری، عدل اور احترامِ انسانیت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

اکیسویں صدی تک آتے آتے اردو افسانہ جن نئے موضوعات سے دوچار ہوا ان میں چند کے موضوعات اس طرح سے بیان کیے جاسکتے ہیں:

فرقہ وارانہ فسادات اور دہشت کے ماحول کی عکاسی، تقسیم کے دیرپا اثرات، داستانوی طرز کا اظہار، نسائیت کے حوالے سے نئے چیلنجز، مغربی نظریات خصوصاً وجودیت، بین التونیت اور پوسٹ کالونیل ایج کی ترجمانی اور ساتھ ہی میڈیا کے مضر و مفید اثرات وغیرہ کو اکیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی کے افسانوں میں صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اکیسویں صدی، انسانوں کے لیے بہت سارے چیلنجز کی سوغات لے کر آئی۔ (4)

اکیسویں صدی کے پاکستانی معاشرے میں منفی مذہبی حساسیت کا ایک نہایت اہم پہلو اقلیتوں کے خلاف شدت پسندانہ رویوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ رمشا مسیح کیس (2012ء)، جوزف کالونی سانحہ (2013ء)، کوٹ رادھا کشن میں عیسائی جوڑے کا بہیمانہ قتل اور سیالکوٹ میں سری لنکن پریانتھا کمارا فیکٹری منیجر کے قتل جیسے واقعات اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جب مذہبی جذبات تعصب، افواہ اور ہجوم کی نفسیات کے تابع ہو جائیں تو قانون، مکالمہ اور انسانی وقار شدید متاثر ہوتے ہیں۔ معاصر اردو افسانہ نگار انہی تلخ زمینی حقائق کو تخلیقی سطح پر برتتے ہوئے مذہبی شدت پسندی کے سماجی اور نفسیاتی اثرات کو نمایاں کرتے ہیں۔ اکیسویں صدی کا اردو افسانہ مذہبی حساسیت کو سماجی تعصب، گروہی نفسیات، معاشی استحصال اور انسانی وقار کی پامالی سے جوڑ کر دیکھتا ہے۔ جب مذہبی شناخت تعصب اور طاقت کے ساتھ مل جاتی ہے تو اس کے نتائج صرف اقلیتوں ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی اخلاقی صورت حال کو متاثر کرتے ہیں۔

اس تناظر میں سلمیٰ افتخار احمد کا افسانہ "رانی گل" خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ افسانے کی ابتدا ایک ایسے ماحول سے ہوتی ہے جہاں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد باہمی میل جول کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ رانی کا بچپن ہندو اور عیسائی سہیلیوں کے ساتھ گزرتا ہے، وہ کرسمس کی تقریبات میں شریک ہوتی ہے اور ہندو شاعر دلورام کی لکھی ہوئی نعت سے گہری عقیدت رکھتی ہے:

> "رانی کو کچھ عرصے سے ایک نعتیہ گیت بہت پسند تھا "من ناچت ہے من گاوت ہے تو راجنم دیوس جب آوت ہے" یہ نعت جب بھی ٹی وی پر آتی تو رانی کا اس کی دھن کے ساتھ جھومنے کو دل چاہتا اس نعت کے بیشتر الفاظ ہندی کے تھے اس نے اپنے باپ سے سن رکھا تھا کہ دلورام ایک ہندو شاعر تھا جنہوں نے نعتیں بھی لکھی تھیں۔ اسے ان کی لکھی نعتیں پڑھنے کی بے حد تمنا تھی۔"(5)

اس کردار کے ذریعے افسانہ نگار یہ واضح کرتی ہیں کہ مذہبی تنوع اپنی اصل صورت میں تصادم نہیں بلکہ مشترکہ تہذیبی زندگی کا حصہ ہے۔ تاہم جب ذاتی مفاد اور مذہبی تعصب ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں تو یہی فضا ایسے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ رحمت، رانی کو حاصل نہ کرسکنے کی صورت میں اس کی نعت سے وابستگی کو مذہبی اشتعال کا ذریعہ بنا کر متعصب مولوی کے سامنے جھوٹا پراپیگنڈا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں رانی اور اس کے باپ کو آگ میں زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ باور کراتا ہے کہ بعض اوقات مذہبی حساسیت کا بحران عقیدے سے زیادہ مذہب کے غلط استعمال اور گروہی نفسیات سے جنم لیتا ہے۔ یہی پہلو اس افسانے کو رمشا مسیح اور جوزف کالونی جیسے حقیقی سانحات کا ایک مؤثر تخلیقی استعارہ بنا دیتا ہے۔

اردو افسانہ معاشرتی زندگی کے تغیرات سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے:

> "افسانے اور قصے دنیائے حقائق سے براہِ راست تعلق رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، حقیقتوں سے الگ تھلگ نہیں ہوتے۔ ان میں حیاتِ انسانی کی سرگرمیاں ہی عکس انداز ہوتی ہیں۔ زندگی کے واقعات و تغیرات کا انعکاس ان میں کہیں بالواسطہ ہوتا ہے اور کہیں بلاواسطہ۔ افسانوں اور قصوں میں حقیقتاً حوصلوں اور عزائم کی روشنی پنہاں ہوتی ہے۔ سماجی زندگی کے تجرباتی نشیب و فراز اور ان سے متعلق امیدیں اور اندیشے ان میں موجود ہوتے

ہیں۔ یہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شادکامیوں اور محرومیوں اخلاقی
بلندیوں اور پستیوں کی مؤثر ترجمانی کرتے ہیں۔ (6)"

مذہبی تعصب کا دوسرا رخ شاہد رضوان کے افسانے "خاک روب" میں سامنے آتا ہے، جہاں اقلیتی شناخت سماجی بائیکاٹ اور طبقاتی نفرت سے جڑ جاتی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار کالو ایک عیسائی خاکروب ہے، جو معاشرے کی گندگی صاف کرتا ہے، لیکن خود اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اس سے فاصلہ رکھتے ہیں، اسے الگ برتن میں پانی دیتے ہیں اور اس کی بنیادی انسانی حیثیت کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ صرف ایک استانی اسے احترام سے پیش آتی ہے، مگر یہی انسانی رویہ بھی معاشرتی بدگمانی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ جب کالو ایک بااثر شخص کے جنسی جرم کا خاموش گواہ بنتا ہے تو اسے بے دردی سے قتل کرکے نالے میں پھینک دیا جاتا ہے اور معاشرے کا کوئی بھی فرد حتیٰ کہ اس کی اپنی برادری بھی اس ظلم کے خلاف لب نہیں کھولتی:

"جب اس بورے کو کھولا جاتا ہے تو اس میں سے ایک لاش نکلتی ہے جس
کے ایک ایک عضو کو کلہاڑی سے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا ہوتا ہے۔
پہلے بازو، پھر ہاتھ اور پاؤں نکلتے ہیں۔ (7)"

افسانہ نگار اس انجام کے ذریعے واضح کرتا ہے کہ اصل آلودگی گندی نالیوں میں نہیں بلکہ اس سماجی ذہنیت میں ہے جو مذہبی اور طبقاتی تعصب کی بنیاد پر انسان کی جان اور عزت دونوں کو بے وقعت بنا دیتی ہے۔

محمد الیاس کا افسانہ "انسان" مذہبی اقلیتوں کے استحصال کی ایک اور جہت یعنی معاشی ناانصافی کو موضوع بناتا ہے۔ وکٹر اور اس کی بیوی ایلس صفائی کا کام کرتے ہیں، مگر انھیں پیشہ ورانہ مجبوری کے ساتھ ساتھ سماجی تحقیر بھی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ ایلس اس حقیقت کو شدت سے محسوس کرتی ہے کہ جن لوگوں کی ظاہری نفاست پر معاشرہ ناز کرتا ہے، ان کے وجود کی بنیادی حقیقت بھی دوسروں سے مختلف نہیں لیکن اس کے باوجود صفائی کرنے والے افراد کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جب ایک بااثر تاجر ایلس کو جنسی استحصال کا نشانہ بنانے میں ناکام رہتا ہے تو وہ جھوٹا مقدمہ قائم کروا دیتا ہے۔ وکٹر اپنی بیوی کو بچانے کے لیے الزام اپنے سر لے لیتا ہے اور پولیس کے تشدد کا شکار ہوتا ہے:

"وکٹر کے ہونٹوں اور سارے جسم پر ان گنت پھنسیاں نکل آئیں، جو چند ہی
دنوں میں رسنے لگی۔ کئی ٹیسٹ ہوئے اور ہر طرح کا علاج۔ یہ ایک معمہ
تھا۔ جو شے وہ عمر بھر بے حساب سمیٹتا رہا، وہی زہر کی طرح خلیوں میں اتر

گئی۔ یہ اندر کی شکست وریخت تھی یا اس کی ذات میں پوشیدہ کوئی انسان جو ہار
گیا تھا۔"(8)

بعد ازاں اس کی برادری کی ہڑتال پورے قصبے کو مفلوج کر دیتی ہے، جس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ جن افراد کو معاشرہ کمتر سمجھتا ہے، درحقیقت انھی کی محنت اس کی روزمرہ زندگی کی بنیاد ہے۔ افسانے کے اختتام پر وکٹر کے جسم پر نمودار ہونے والے زخم مسلسل تذلیل، معاشی استحصال اور انسانی وقار کی شکست کا استعارہ بن جاتے ہیں۔

مذہب میں علم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ قرآنِ مجید کی پہلی وحی ہی اقرأ سے آغاز کرتی ہے اور انسان کو قلم کے ذریعے علم عطا کیے جانے کو خدائی نعمت قرار دیتی ہے۔(9) جب کہ سورۂ زمر میں اہلِ علم اور غیر اہلِ علم کے درمیان واضح امتیاز قائم کیا گیا ہے۔(10) اسی طرح دیگر مذاہب بھی علم، حکمت اور تعلیم کو انسانی تہذیب کی بنیاد تصور کرتے ہیں۔ اس لیے تعلیمی اداروں پر حملے انسان کے فکری اور اخلاقی وجود پر حملہ شمار ہوتے ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں میں ملالہ یوسف زئی پر حملہ، سوات میں طالبات کی تعلیم پر پابندیاں، سانحۂ آرمی پبلک سکول، بلوچستان میں اساتذہ اور تعلیمی اداروں کو نشانہ بنائے جانے جیسے واقعات نے یہ حقیقت آشکار کی ہے کہ شدت پسند گروہ شعور، مکالمے اور تعلیم کو اپنے نظریاتی مفادات کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں اس صورتِ حال کی مؤثر عکاسی ملتی ہے۔

نجم الحسن رضوی کے افسانے "پری گل" میں دہشت گردی کے باعث ایک پورا گاؤں نقل مکانی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہجرت کے اس کربناک منظر میں ہر شخص اپنی قیمتی اشیا بچانے کی فکر میں ہے، مگر ایک معصوم لڑکی اپنے قیمتی ہار کے بجائے اپنی درسی کتاب کو محفوظ رکھنے کا انتخاب کرتی ہے۔ جب اس کا والد سمجھتا ہے کہ وہ زیورات لے آئی ہو گی تو ڈبہ کھولنے پر اس میں صرف اسکول کی کتاب موجود ہوتی ہے:

> "اب تو جلدی سے ڈبے میں سے اپنا ہار نکال کے گلے میں پہن لے، ڈبے کو
> لے جاکے کیا کریں گے۔ ٹھیک ہے۔ شیر ولی نے کہا۔ "ہار۔" پری گل ہنسی۔
> ہار تو اس میں نہیں ہے بابا۔ کیا؟!شیر ولی نے حیران ہوتے پوچھا۔ پری گل
> نے لال ڈبہ کھولا۔ اندر چمکتے ریشمی خانے میں کتاب رکھی تھی۔ اس کے
> اسکول کی کتاب۔ رنگین تصویر والی۔ شیر ولی حیرت زدہ رہ گیا۔"(11)

افسانہ نگار اس کے ذریعے واضح کرتا ہے کہ شدت پسند اگرچہ اسکولوں، اساتذہ اور کتابوں کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن علم کی حقیقی قدر انسان کے باطن میں زندہ رہتی ہے۔ کتاب ہیرے اور موتیوں پر فوقیت حاصل کر لیتی ہے اور علم، مادی دولت کے مقابلے میں ایک دائمی سرمایہ بن کر ابھرتا ہے۔

تعلیمی اداروں پر دہشت گرد حملوں کا دوسرا نہایت مؤثر اظہار اصغر ندیم سید کے افسانے "ایک اور شہر افسوس" میں ملتا ہے۔ افسانہ سانحۂ آرمی پبلک اسکول پشاور کے پس منظر میں تخلیق کیا گیا ہے، جہاں معصوم طلبہ کو علم حاصل کرنے کے جرم میں دہشت گردی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

"پھر ایک قیامت برپا ہوئی، ہر بچے کے گرد چار چار مائیں جمع ہو گئیں۔ کسی نے اپنے بچے کا بازو شناخت کر کے بازو اٹھا لیا، کسی نے ٹانگ میں جراب کا سرا پہچانا اور اسے دھڑ سے الگ کر کے گود میں رکھ لیا۔ اب ہر بچے کا ثابت جسم پھر سے اعضا میں تقسیم ہو گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ ان سو بچوں میں چار سو بچے شامل تھے۔ اب میزیں خالی ہو چکی تھیں، سب اپنے اپنے بچوں کیا اعضاء پہچان کر لے گئے۔ [12]"

افسانہ نگار بچوں کے بکھرے ہوئے اعضا اور اپنے پیاروں کو شناخت کرتی ہوئی ماؤں کے دردناک منظر کے ذریعے یہ دکھاتا ہے کہ مذہب کی انتہاپسندانہ تعبیر کس طرح انسانیت، تعلیم اور مستقبل تینوں کو بیک وقت زخمی کرتی ہے۔ افسانے کا اصل المیہ صرف بچوں کی شہادت نہیں بلکہ اس فکر کی شکست ہے جو مذہب کے نام پر قلم اور کتاب کو دشمن سمجھتی ہے۔

تمام مذاہب میں عبادت گاہیں انسانی عقیدے، تہذیبی شناخت اور روحانی وابستگی کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ اسلام نے بھی مساجد کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کے احترام اور تحفظ پر زور دیا ہے۔ قرآنِ مجید مساجد کی بربادی کو ظلم قرار دیتا ہے۔[13] خانقاہوں، گرجاؤں، عبادت گاہوں اور مساجد کے تحفظ کو اجتماعی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔[14] سیرتِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کی روایت بھی اسی اصول کی تائید کرتی ہے، جہاں غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کے احترام کو ریاستی ذمہ داری سمجھا گیا۔ اس پس منظر میں عبادت گاہوں پر حملہ کسی ایک مذہب کے خلاف نہیں بلکہ مذہبی اخلاقیات اور انسانی تہذیب کے خلاف اقدام بن جاتا ہے۔ اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں اس المیے کو گہرے شعور کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اصغر ندیم سید کے افسانے "ایک اور شہر افسوس" میں مذہبی شدت پسندی کسی ایک گروہ تک محدود نہیں رہتی بلکہ صوفی مزارات، چرچ اور معصوم شہری سب اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ ایک مقام پر عرس کے اجتماع میں ہونے والا دھماکہ انسانی جانوں کے ساتھ صوفی روایت کے امن پسند تصور کو بھی زخمی کرتا ہے:

"یہ کس پیر بزرگ کا سالانہ عرس کا میلہ تھا۔۔۔ تو بس اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور آگ لگ گئی۔۔۔ میرے سامنے عورتوں لڑکیوں بچوں اور بزرگوں کے جسم جل رہے تھے مختلف اعضا بکھر رہے تھے۔ ایک عورت کا

سر میرے پاس آکر گرا۔۔۔ تن سے جدا ہو چکا تھا پھر بھی کلمہ پاک کا ورد کر رہا تھا۔“(15)

دوسری طرف، عیسائیوں کے چرچ اور ان کی بستی پر مشتعل افراد کا حملہ دکھایا گیا ہے، جہاں لاؤڈ اسپیکر کے جذباتی استعمال کے بعد پورا چرچ جلا دیا جاتا ہے:

”ابھی چرچ میں دعا جاری تھی کہ قریب کی ایک چھوٹی سی مسجد سے دو تین بار ایک اعلان کیا گیا۔ اعلان میں مقامی مولوی صاحب کا جوش بھی شامل تھا۔ وہ آبادی جو چند لمحے پہلے سکون اور آسودگی میں سانس لے رہی تھی۔ یکدم وہاں شور مچاتا ایک ہجوم ہاتھ میں پٹرول، مٹی کا تیل اور زبانوں سے نکلنے والے شعلوں کے ساتھ چرچ پر حملہ آور ہو گیا۔ چرچ میں آگ کے شعلوں اور دھوئیں سے قیامت برپا ہو گئی۔۔۔“(16)

افسانہ نگار اس کے ذریعے واضح کرتا ہے کہ جب مذہب کو سیاسی اور پرتشدد مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو عبادت گاہیں امن کی علامت نہیں رہتیں بلکہ نفرت کی سیاست کا پہلا ہدف بن جاتی ہیں۔ عبادت گاہوں کی بے حرمتی دراصل مذہب کی حقیقی روح سے انحراف ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے ”ابا کا صندوق“ میں یہی مسئلہ زیادہ داخلی اور فکری انداز میں سامنے آتا ہے۔ افسانہ نگار کے نزدیک مذہبی عمارتیں خدا کو قید کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ متعصب سوچ خدا کو محبت اور انسانیت کے بجائے عمارتوں اور گروہی شناخت میں مقید کر دیتی ہے۔ راوی جب ایک جلے ہوئے گرجاگھر اور بعد ازاں فرقہ وارانہ کشیدگی کا شکار مسجد کو یاد کرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ انتہا پسندانہ ذہنیت صرف دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو نہیں بلکہ اپنے ہی مذہبی مراکز کو بھی تقسیم اور تباہ کر دیتی ہے۔

”مسجد کو آگ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جس بات کا کسی کو خیال تک نہ آئے۔۔۔ سب ہو جائے تو لیکن وہ سب ہوا۔ پورے گاؤں میں شدید غصہ اور رنج پیدا ہوا۔ انھی دنوں دوسری مسجد جس پر سیاہ علم لہراتا تھا پولیس کا پہرہ بٹھایا گیا۔ اور اس کے والد سمیت باقی بزرگوں کو یقین دلایا گیا کہ وہ سب کسی کافر نے کیا تھا، اور اسی کافر نے دو ماہ پہلے شہر کی اس امام بارگاہ کو آگ لگائی تھی۔“(17)

مذہبی تشدد کسی ایک مذہب کو نہیں بلکہ پوری انسانی تہذیب کو زخمی کرتا ہے۔ رشید امجد کے افسانے "قطرہ سمندر قطرہ" میں مندر میں دھماکا ہوتا ہے:

> "ایک دھماکہ ہوتا ہے اور بڑے مندر کی دیوار نیچے آرہتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے بھگوان کی مورتی ہے اور مورتی کے ساتھ چمٹی ہوئی کوشلیا۔۔۔میں چیختا ہوں کوشلیا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے آنکھیں کھولتی ہے اور دوبارہ مضبوطی سے مورتی کو تھام لیتی ہے۔"(18)

عبادت گاہ انسان کی روحانی وابستگی کا مرکز ہوتی ہے۔ معبد کی تباہی دراصل ایک تہذیب، ایک یادداشت اور ایک اجتماعی احساس کے انہدام کی علامت بن جاتی ہے۔ اکیسویں صدی کا اردو افسانہ عبادت گاہوں کی تباہی کو مذہبی یا سیاسی واقعہ نہیں سمجھتا بلکہ اسے انسانی اقدار، بین المذاہب احترام اور اجتماعی شعور کے بحران سے جوڑ کر دیکھتا ہے۔ جب مذہب اپنی اخلاقی بنیادوں سے جدا ہو کر طاقت اور غلبے کا ذریعہ بن جائے تو سب سے پہلے عبادت گاہوں کا تقدس پامال ہوتا ہے اور اس کے ساتھ انسان کا روحانی اعتماد بھی مجروح ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ افسانے مذہبی رواداری، انسانی احترام اور عبادت گاہوں کے تحفظ کے حق میں ایک مضبوط ادبی اور اخلاقی بیانیہ تشکیل دیتے ہیں۔

نجم الحسن رضوی کے افسانے "دعا فروش" میں مسجد پر ہونے والا دھماکہ انسان کے روحانی یقین کے ٹوٹنے کا استعارہ بن جاتا ہے۔ چند لمحوں میں مسجد، نمازی اور پوری آبادی ملبے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بوڑھا کردار یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے دعائیں بھی قبولیت کے دروازے سے لوٹ آئی ہوں:

> "اسی وقت زور کا دھماکہ ہوا، اتنے زور کا جیسے سر پر بادلوں بھرا آسمان پھٹ پڑا ہو۔۔۔جب اس کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے دیکھا وہ گلی کے اندر ہے مگر شاید وہ گلی نہیں تھی یہاں امکان نہیں تھے، نیم کا پیڑ نہیں تھا، پیڑ کے پیچھے کی دیوار نہیں تھی، دیوار کے پیچھے گھر نہیں تھا، گھر کے پیچھے مسجد نہیں تھی، مسجد کے اندر نمازی نہیں تھے، گھروں کے اندر لوگ نہیں تھے۔ فضا میں بارود کی بو تھی اور ہر طرف ملبہ تھا۔"(19)

اکیسویں صدی کے اردو افسانے کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ معاصر افسانہ نگاروں نے منفی مذہبی طرزِ احساس کے مسئلے کو عقیدے یا مذہبی اختلاف کے تناظر میں نہیں دیکھا بلکہ اسے انسانی زندگی، سماجی تعلقات، تعلیم، عبادت گاہوں کے تحفظ اور اقلیتوں کے حقوق سے جوڑ کر پیش کیا ہے۔ ان افسانوں میں مذہب کی اصل روح، یعنی محبت،

رواداری، عدل، احترامِ انسانیت اور علم دوستی کو مثبت قدر کے طور پر نمایاں کیا گیا ہے جبکہ تعصب، انتہا پسندی، فرقہ واریت، مذہبی منافرت اور طاقت کے حصول کے لیے مذہب کے استعمال کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ رانی گل، کالو، وکٹر، پری گل اور مذہبی دہشت گردی کے شکار دیگر کردار دراصل ہمارے عہد کے اُن ان گنت انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو مذہب کی غلط تعبیرات اور شدت پسندانہ رویوں کی وجہ سے اذیت، محرومی اور عدم تحفظ کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ افسانے ہمیں اس حقیقت کا احساس دلاتے ہیں کہ مذہب جب اپنی اخلاقی اور روحانی بنیادوں سے جڑا رہے تو انسانوں کے درمیان محبت، احترام اور ہم آہنگی پیدا کرتا ہے لیکن جب اسے نفرت، غلبے اور تعصب کا ہتھیار بنالیا جائے تو اس کے نتائج پورے معاشرے کو متاثر کرتے ہیں۔ اسی لیے اکیسویں صدی کا اردو افسانہ نہ صرف اپنے عہد کے مذہبی اور سماجی بحرانوں کا مؤثر ثبوت ہے بلکہ ایک ایسے انسانی اور اخلاقی شعور کی تشکیل بھی کرتا ہے جو امن، رواداری اور باہمی احترام پر مبنی معاشرے کے قیام کی ضرورت کو اجاگر کرتا ہے۔

حوالہ جات

1 .Karen Armstrong, Fields of Blood: Religion and the History of Violenc, New York: Alfred A. Knopf, 2014, 45.

2۔ ارشد محمود، "ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ"، کراچی: آج پبلی کیشنز، 2012، ص15

3۔ مہدی جعفر، نیا افسانہ ء اظہار کے چند مسائل، مشمولہ: اردو افسانہ روایت اور مسائل، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1981، ص657

4۔ محمد غالب نشتر، اردو افسانہ نئی جست، دہلی: جے۔ کے آفسٹ، 2015، ص74

5۔ سلمیٰ افتخار احمد، رانی گل'، مشمولہ: رنگِ شہر، لاہور: ماورا پبلشرز، 2015، ص58

6۔ نفیس فاطمہ، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور معاشرتی زندگی، بہار: کتابستان، 2014، ص16

7۔ شاہد رضوان، خاک روب، مشمولہ: آوازیں، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، 2015ء، ص166

8۔ محمد الیاس، انسان، مشمولہ: مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں، راولپنڈی: نواب سنز پبلیکیشنز، 2007، ص125

9۔ القرآن الکریم، (العلق: 1-4)

10۔ القرآن الکریم، (الزمر: 9)

11۔ نجم الحسن رضوی، پری گل، مشمولہ: نجم الحسن رضوی کے بہترین افسانے، ڈاکٹر عنبرین حسیب عنبر (مرتبہ)، کراچی: اکادمی بازیافت، 2016ء، ص263

12۔ اصغر ندیم سید، ایک اور شہر افسوس، مشمولہ: شہر افسوس، لاہور: سنگِ میل پبلیشرز، 2017، ص95

13۔ البقرہ: 114

14۔ سورۂ حج (22:40)

15۔ اصغر ندیم سید، ایک اور شہر افسوس، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2017، ص90-91

16۔ ایضاً، ص: 100

17۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، فرشتہ نہیں آیا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2017، ص38

18۔ رشید امجد، سمندر قطرہ سمندر، مشمولہ: The Lamp Post اور دوسرے افسانے، اسلام آباد: دوست پبلیکیشنز، 2020 ص78

19۔ نجم الحسن رضوی، دعا فروش، مرتبہ: ڈاکٹر امبرین حسیب عنبر، کراچی: اکادمی بازیافت، 2016، ص274

References:

1. Karen Armstrong, Fields of Blood: Religion and the History of Violence (New York: Alfred A. Knopf, 2014), 45.
2. Arshad Mahmood, "Thaqafati Ghuttan Aur Pakistani Muashra", Karachi: Aaj Publications, 2012, p. 15.
3. Mehdi Jafar, "Naya Afsana: Izhar Ke Chand Masael", Mashmula: Urdu Afsana Riwayat Aur Masael, Murattaba: Gopi Chand Narang, Delhi: Educational Publishing House, 1981, p. 657.
4. Muhammad Ghalib Nishtar, Urdu Afsana Nai Jast, Delhi: J.K. Offset, 2015, p. 74.
5. Salma Iftikhar Ahmad, "Rani Gul", Mashmula: Rang-e-Shahar, Lahore: Mavra Publishers, 2015, p. 58.
6. Dr. Nafis Fatima, Urdu Afsana Aur Muashrati Zindagi, Bihar: Kitabistan, 2014, p. 16.
7. Shahid Rizwan, "Khakrub", Mashmula: Aawazain, Lahore: Sanjh Publications, 2015, p. 166.
8. Muhammad Ilyas, "Insaan", Mashmula: Mor Pankh Pe Likhi Aankhein, Rawalpindi: Nawab Sons Publications, 2007, p. 125.
9. Al-Quran Al-Kareem, (Al-Alaq: 1-4)
10. Al-Quran Al-Kareem, (Az-Zumar: 9)
11. Najam-ul-Hasan Rizvi, "Pari Gul", Mashmula: Najam-ul-Hasan Rizvi Ke Behtareen Afsane, Dr. Ambreen Haseeb Amber (Murattaba), Karachi: Academy Bazyaft, 2016, p. 263.
12. Asghar Nadeem Syed, "Ek Aur Shehr-e-Afsos", Mashmula: Shehr-e-Afsos, Lahore: Sang-e-Meel Publishers, 2017, p. 95.
13. Al-Baqarah: 114
14. Surah Al-Hajj (22:40)
15. Asghar Nadeem Syed, Ek Aur Shehr-e-Afsos, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2017, pp. 90-91.
16. Aizan (Ibid.), p. 100.
17. Dr. Nasir Abbas Nayyar, Farishta Nahi Aaya, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2017, p. 38.
18. Rasheed Amjad, "Samandar Qatra Samandar", Mashmula: The Lamp Post Aur Doosre Afsane, Islamabad: Dost Publications, 2020, p. 78.

19. Najam-ul-Hasan Rizvi, "Dua Farosh", Murattaba: Dr. Ambreen Haseeb Amber, Karachi: Academy Bazyaft, 2016, p. 274.